© rasailojaraid.com

قسط ۲

کلکتہ میں دس دن

(مولانا) سعید احمد اکبرآبادی

ان دوستوں کے علاوہ مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی قائم مقام پرنسپل کلکتہ مدرسہ، ڈاکٹر سید منال شاہ القادری (ریڈر فارسی کلکتہ یونیورسٹی)، مسٹر عبدالقادر (ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول کلکتہ مدرسہ) اور جناب علقمہ شبلی (اردو کے مشہور ادیب اور شاعر) بھی ہوٹل میں آئے اور ان سے بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ ساڑھے چار بجے کا وقت ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق خواجہ محمد یوسف اور مجید صاحب پہنچ گئے۔ جو حضرات اس وقت موجود تھے۔ ان سے اجازت لے کر ان دونوں کے ساتھ ٹیکسی میں روانہ ہو کر ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی کے مکان پر پہونچا۔ ڈاکٹر صاحب جس علم و فضل کے بزرگ تھے۔ اسے سب اہل علم جانتے ہیں۔ عربی اور انگریزی میں ان کی کتابیں اور مقالات تحقیق کا شاہکار ہیں۔ کیمبرج سے ڈاکٹر ہونے کے ساتھ مدرسہ عالیہ رامپور میں کئی سال تعلیم پا چکے تھے۔ اس لئے ارباب مدارس کی طرح ان کی عربی استعداد نہایت پختہ تھی۔ علوم نقلیہ اور عقلیہ دونوں میں بڑا درک رکھتے تھے۔ کیمبرج اور مدرسہ دونوں جگہوں کی تعلیم نے برصغیر کے دفاترۃ یورپ میں نہایت ان کو ممتاز اور موقر بنا دیا تھا۔ کلکتہ میں عرصہ سے پروفیسر اور شعبہ عربی و فارسی کے صدر تھے۔ میری اور اُن کی عمر میں بڑا فرق تھا۔ عرصہ سے ان کا نام سنتا اور ان کے مقالات اور کتابیں پڑھتا آیا تھا۔ اس لئے میرے لئے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اسی کے مطابق میں ان کا ادب و احترام کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کلکتہ مدرسہ گورننگ باڈی ممبر بھی تھے۔ لیکن میرے کلکتہ پہونچنے کے بعد ہی مجھ میں اور ڈاکٹر صاحب میں نہایت گہرے عزیزانہ تعلقات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدا ہوگئے۔ یہاں تک کہ بیگم صاحبہ مجھے بھائی کہنے لگیں۔

ڈاکٹر صاحب طبعاً کم آمیز اور دیر آشنا تھے۔ اس لئے کسی کے گھر آتے جاتے نہیں تھے۔ لوگ اس کو پندار و تمکنت پر محمول کرتے تھے۔ لیکن میرے ساتھ ان کا یہ معاملہ تھا کہ ایک ہفتہ میں ایک دن عصر و مغرب کے درمیان مع بیگم صاحبہ کے وہ میرے یہاں اپنی کار میں آتے اور ایک مرتبہ میں ان کے یہاں مع متعلقین کے جاتا اور ملاقات کے دنوں کے علاوہ ٹیلیفون پر خیر و عافیت دریافت کر لیتے تھے۔ بعض لوگوں کو اس پر اچنبھا بھی ہوتا تھا۔ مگر بات یہی تھی تا آنکہ مارچ ۱۹۷۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ میں پاکستان میں تھا۔ ہندوستان واپس آکر برہان کے نظرات میں تعزیتی نوٹ لکھا لیکن اُس حادثہ کے بعد اب میں پہلی مرتبہ کلکتہ آیا تھا۔ اس لئے یہاں پہونچکر پہلا کام یہ کیا کہ تعزیت کے لئے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر حاضر ہوا۔ مگر افسوس ہے گھر پر کوئی موجود نہ تھا۔ صرف مرحوم کی پوتی تھی۔ اس سے بات کر کے ہم لوگ واپس آگئے۔ زیادہ افسوس اس بات سے ہوا خواجہ محمد یوسف نے بتایا کہ وہ ٹیلیفون پر مرحوم کے فرزند ڈاکٹر خالد کو اس وقت میرے ان کے گھر پہونچنے کی اطلاع پہلے سے دے چکے تھے۔ اس لئے اگر انہیں اور گھر والوں کو وقت کے وقت کوئی ضروری کام نکل آیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں رہ سکتے تھے تو کم از کم مکان پر ایک پرچہ تو چھوڑ جاتے مگر انہوں نے یہ بھی نہیں کیا۔ خیر! یہاں سے نکل کر کلکتہ مدرسہ کے ایک عزیز رفیق اور دوست مولوی سید عبدالغنی برکتی کے مکان پر پہونچے۔ چند ماہ پہلے ان کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ مدرسہ عالیہ (کلکتہ مدرسہ کا شعبہ عربی) میں استاد تھے۔ ان کا تقرر میں نے ہی کرایا تھا۔ مجھ سے ربط و تعلق خاص تھا۔ نہایت سوشل اور وسیع التعلقات تھے۔ گھر کے خوشحال تھے۔ کار رکھتے تھے۔ اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں کے پُرجوش مقرر اور بڑے خوش ذوق اور ہمہ فن انسان تھے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس وقت ان کے مکان پر بھی کوئی نہیں ملا۔ مکان پر ایک نوٹ چھوڑ کر ہم لوگ واپس ہوگئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لکچر ۲۲ ستمبر کو مغرب کی نماز کے بعد لکچر تھا مگر اس سے پہلے چائے تھی۔ چائے بہت پر تکلف تھی۔ سوسائٹی کے عہدہ داروں، ممبروں اور دوسرے حضرات کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ چائے کے بعد مغرب کی نماز جماعت سے پڑھی۔ اور پھر ایمان سوسائٹی بلڈنگ کے ہال میں جلسہ کی کارروائی شروع ہوگئی۔ ڈائس پر سوسائٹی کے صدر مسٹر روسی بی چینی جو کلکتہ کے شیرف (SHERRIF) رہ چکے ہیں۔ اور بڑے لائق و قابل اور خوش ذوق انسان ہیں۔ سینٹر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ان کے دائیں بائیں سوسائٹی کے نائب صدر ڈاکٹر حافظ اکریم برتن پروفیسر و صدر شعبہ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی اور مسٹر روی پولڈین پرنسپل ارمینین کالج کلکتہ تشریف فرما تھے پہلے جناب صدر نے بڑی دلچسپ اور پُر لطف خیر مقدمی تقریر کی۔ پھر ان کے کہنے پر خواجہ محمد یوسف نے ڈاکٹر محمد اسحٰق میموریل لکچر کی غرض و غایت اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی اس مجلس کی مقرر کی نسبت اپنے جذبات محبت و مودت کا بلیغ انگریزی میں اظہار کیا۔

یہ سب کچھ ہوگیا تو جناب صدر کی درخواست پر میں کھڑا ہوا اور پہلے میں نے زبانی تقریر میں اپنے اس تعلق کو بیان کیا جو کلکتہ میں قیام کے زمانہ میں ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب مرحوم اور ان کی قائم کردہ سوسائٹی سے تھا۔ اور اپنے اس قریبی تعلق کی روشنی میں بتایا کہ درحقیقت مرحوم ایک انسان اور ایرانیات کے فاضل ہونے کی حیثیت سے کس مرتبہ کے بزرگ تھے۔ پھر میں نے سوسائٹی کا شکریہ ادا کیا کہ اس لکچر کے لئے اس نے یاد کیا یہ زبانی تقریر دس پندرہ منٹ کی ہوگی۔ اس کے بعد لکچر جو فلیسکیپ کے پندرہ صفحات میں ٹائپ شدہ تھا پڑھنا شروع کیا۔ اس لکچر میں عربوں کی تاریخ نویسی کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد طبری سے لے کر مسکویہ تک ان مورخوں اور ان کی تاریخ نویسی کی خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ جو اگرچہ تھے تو ایرانی النسل لیکن انہوں نے اپنی تاریخیں عربی میں لکھی ہیں۔ اور جن میں ان کے ایرانی رجحانات اور ایرانی روایات و معتقدات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ے اثرات صاف طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے اس کا بھی ذکر کیا کہ
ان مورخین کے ماخذ و مصادر کیا رہے ہیں۔ اور اصولِ نقد و جرح کی روشنی میں ان راویوں
ں سے کون کس مرتبہ کا تھا۔ سیرت حضرت عثمان کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں ان،
ب تاریخوں کو کھنگال چکا تھا۔ اس بناپر سارا مواد ذہن میں تازہ تھا۔ اسی کی اساس
یہ مقالہ مرتب ہو گیا۔

لکچر بڑے صبر و سکون اور دلچسپی سے سنایا گیا۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ
شروع ہوا۔ مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی اور پروفیسر جگدیش نرائن سرکار کے سوالات
ے خود مجھے بہت فائدہ ہوا۔ مجمع کافی اچھا تھا۔ ہال پُر تھا۔ دوسرے روز پروفیسر مسعود حسین
صاحب نے ہوٹل میں ٹیلیفون پر لکچر کی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں شروع
ے ایران سوسائٹی کے ساتھ وابستہ رہا ہوں۔ اور اب تک ڈاکٹر محمد اسحٰق میموریل
لکچر جتنے ہو چکے ہیں ان سب میں شریک ہوا ہوں۔ لیکن کل جتنا مجمع آپ کے لکچر میں تھا،
کسی میں نہیں دیکھا۔ یہ بات تو اور دوستوں نے بھی کہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پروفیسر
صاحب نے ایک اور بات ایسی کہی جسے سُن کر میرا جی بھر آیا۔ انہوں نے کہا۔ اور ہاں!
آپ نے دیکھا نہیں ہوگا۔ ہال سے باہر لان پر اور اس کے پیچھے بھی بہت سے لوگ،
ے ہوئے تقریر سن رہے تھے۔ لیکن بہاریوں کے طرز پر یہ میلی کچیلی بنیان پہنے اور
لنگی باندھے ہوئے تھے۔ اور صورت و شکل سے معمولی دوکاندار، رکشا والے اور
ر معلوم ہوتے تھے۔ کسی نے ان لوگوں سے پوچھا؛ تقریر تو انگریزی میں ہو رہی
تم لوگ کیوں کھڑے ہو؟ انہوں نے بہاری بولی اور لب و لہجہ میں جواب دیا "ہم
سنا ہے کہ ہمارے پہلے پرنسپل مدرسہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں دیکھنے آئے
میں نے دل میں کہا؛ اللہ! تیری شان ہے میں یہاں تھا تو عوام میں بھی
مقبول تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہر شخص کی پسند و ناپسند کا معیار جُدا جُدا ہوتا ہے۔ جناب سالک لکھنوی جو اردو کے مشہور اور ترقی پسند شاعر ادیب اور نقاد ہیں، (ان کا مفصل تذکرہ آگے آرہا ہے) انہوں نے دو روزہ قیامِ کلکتہ کے دوران میں متعدد بار کہا۔ آپ کا مقالہ علمی اور فنی تھا۔ اس کی قدر و قیمت تو اربابِ علم ہی پہچان سکتے ہیں۔ ہم جیسے عام لوگوں کو تو آپ کے مقالہ سے پہلے پندرہ منٹ کی زبانی تقریر مزہ دے گئی۔ جس میں آپ نے شستہ زبان میں کلکتہ ایران سوسائٹی اور ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر کا تذکرہ کیا تھا سالک صاحب کا یہ ریمارک اگر کوئی طنز نہیں ہے تو اس کو میرے خلوصِ اظہار پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

ہال میں حضرات موجود تھے۔ ان میں کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ مدرسہ اور مولانا آزاد کالج (سابق سنٹرل کلکتہ کالج) کے اکثر اساتذہ اور ان کے علاوہ شہر کے بعض اربابِ علم و ادب تو میرے جانے پہچانے دوست تھے۔ لیکن اکثریت ان حاضرین کی تھی جن میں واقف نہیں تھا۔ اول الذکر طبقہ میں سے جن احبابِ خاص سے ملاقات ہوئی ان میں قابل ذکر جناب حاجی محمد سلیمان داؤدا، جناب سالک لکھنوی، سید امیر رضا کاظمی، قاضی محمد الماس مالک کوہ نور پرنٹنگ پریس، مسٹر عبداللہ ایم۔ اے۔ (کلکتہ مدرسہ)، پروفیسر نیاز احمد، اور پروفیسر عطا کریم برق ہیں۔

دوسرے طبقہ کے جن حضرات سے یہاں پہلی مرتبہ ملاقات کر کے بڑی مسرت ان میں پروفیسر جگدیش نرائن سرکار، اور مسٹر جی۔ ایس فرید کا ذکر اور تعارف ضروری ہے۔

پروفیسر جگدیش نرائن سرکار | ایک عرصہ تک بہار یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے ہیں، پھر ایک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہوئے، ۱۹۶۲ء مغربی بنگال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشہور جادو پور یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ تاریخ ہو کر چلے آئے، اور ۱۹۶۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ موجودہ صدی کے وسط میں بنگال نے پروفیسر جادو ناتھ سرکار، پروفیسر آر، سی، مزمدار اور پروفیسر ایس، پی، سین جیسے نامور مورخین قرونِ وسطیٰ پیدا کئے ہیں، پروفیسر موصوف اسی طبقہ کے ایک رکن رکین ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کا سب سے بڑا سرمایہ فارسی زبان میں ہے۔ اس لئے یہ فارسی زبان اور اس کے لٹریچر سے خوب واقف ہیں۔ بیسیوں انٹرنیشنل اور نیشنل تاریخی کانفرنسوں میں شریک ہو کر اپنے موضوع سے متعلق قابلِ قدر مقالات پڑھ چکے ہیں۔ قیام کلکتہ کے زمانہ میں پروفیسر جادو ناتھ سرکار، مزملدار اور سین سے تو میری ملاقات تھی بعض کمیٹیوں میں ان کے ساتھ میں بھی ممبر تھا لیکن پروفیسر جگدیش چونکہ اس زمانہ میں کلکتہ سے باہر رہتے تھے اس لئے ان سے کبھی ملنا نہ ہوا تھا۔ اب اس وقت ان سے چائے پر ملاقات ہوئی اور پھر مقالہ کے بعد پھر چند دوستوں کے ساتھ سکریٹری کے کمرہ میں جا کر بیٹھا تو یہ بھی یہاں آ گئے۔ اور دیر تک لکچر کے بعض اجزاء کی نسبت گفتگو کرتے رہے۔ میں واقعی ان کے مطالعہ، وسعت معلومات اور اخلاق سے کافی متاثر ہوا۔ ایران سوسائٹی کی بعض کمیٹیوں کے سرگرم ممبر بھی ہیں۔

ایک علمی ہدیہ چائے پر انہوں نے اپنی ایک نئی کتاب بھی ازراہِ کرم ہدیہ کی تھی کتاب کا نام ہے۔ "ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ میں تاریخ نویسی کی تاریخ" انگریزی کے باریک ٹائپ میں تقریباً دو سو صفحات کی کتاب ہے۔ طباعت اور گیٹ اپ دونوں خوب صورت جلد دبیز اور مضبوط قیمت پچاس روپے: پتہ: رتنا پرکاش کلکتہ ۲۷۔۔۔۔۔۔۔۷۔ یہ کتاب علیگڈھ میں میری نظر سے گذر چکی تھی، لیکن اطمینان سے پڑھنے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اب کلکتہ میں قیام کے دنوں میں ہی اس کو از اول تا آخر پڑھا تو نہایت ہی محظوظ ہوا۔ اس کتاب میں جو مصنف کے پندرہ برس کی تحقیق و مطالعہ کا حاصل اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدت میں لکھے اور شائع شدہ مقالات کا مجموعہ ہے، چھ باب ہیں۔ اور ہر باب کے ماتحت متعدد فصول ہیں۔ ان میں پہلے ہندو تاریخ نویسی، اس کی قسمیں اور خصوصیات پر کلام ہے، پھر مسلمانوں کی تاریخ نویسی جس کا ذیلی عنوان ہی ہے "ہندوستان کو ایک عجیب تحفہ" اسلام میں اس کے آغاز اور اس کی خصوصیات پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد تیسرا باب مسلمانوں کی ہندوستان کی تاریخ نویسی پر بحث کیلئے مخصوص ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) عرب کا فاتحانہ داخلہ (۲) ترکوں اور افغانوں کا عہد۔ (۳) مغلیہ سلطنت کا عہد، مصنف نے ہر عہد کے مورخین اور جغرافیہ نویسوں کو الگ الگ ایک فصل میں بیان کرکے ان کے تاریخی سرمایہ اور اس کی قدر و قیمت کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ چوتھا باب مورخین کے نصب العین، مقصد اور ان کے طریقۂ کار پر بحث و گفتگو کے لئے وقف ہے۔ پانچواں باب جس کا عنوان ہے۔ "نئی اسپرٹ" اس کے ماتحت البیرونی، ابوالفضل اور بدایونی کی تاریخ نویسی اور اس کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹا باب جو کتاب کا آخری باب ہے۔ اس میں سابق ابواب میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس پر تبصرہ ہے۔ اور اس سے چند نتائج ماخوذ ہوتے ہیں ان کو بیان کر دیا گیا ہے۔ شروع میں جو مقدمہ ہے۔ وہ بھی بہت مفید اور معلومات افزا ہے "تاریخ نویسی کی تاریخ" ایک نیا موضوع ہے۔ ہندوستان میں اس پر تھوڑا بہت جو کام ہوا ہے۔ مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مغربی ممالک کی مختلف زبانوں میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس کا جو خاکہ پیش کیا ہے۔ کم از کم اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ان کتابوں اور ان کے مصنفوں کے ناموں سے میں پہلی مرتبہ واقف ہوا۔

اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ نویسی کی شرط اول معروضیت (OBGECTIVAITY) ہے لیکن مورخ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جذبات واحساسات اور مذہبی و سیاسی معتقدات ہوتے ہیں۔ جن پر سوسائٹی، ماحول او حکومتِ وقت کے کردار وعمل اور اس کے نظام کی چھاپ ہوتی ہے، پہلا زمانہ شخصی حکومتوں اور استبداد کا زمانہ تھا۔ جو مورخ دربار شاہی سے یا کسی امیر وزیر کی درگاہ سے وابستہ ہوتے تھے۔ ان کا ذکر نہیں۔ جو مورخ آزاد تھے وہ بھی سلاطین کی قصیدہ خوانی اور ان کے کارناموں کی تعریف و توصیف اور ان کے مذہبی افکار و خیالات کی روشنی میں ان کارناموں کی تشریح و توجیہہ میں مبالغہ آرائی سے بمشکل ہی پہلو بچا سکتے تھے، اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ اس عہد کی تاریخ نویسی کا انداز وہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو عصرِ حاضر کی تاریخ نویسی کا ہے۔ جبکہ یہ فن ترقی کر کے ایک سائنس بن گیا ہے۔ اور جمہوریت، آزادی، اور مساواتِ انسانی کے فلک پیما نعروں نے مورخ کے قلم کو آزاد کر دیا ہے۔ لیکن حقیقی معروضیت اگر پہلے نہیں تھی تو اب بھی نہیں ہے۔ جو مورخ کمیونسٹ ہیں وہ اپنے نقطۂ نظر سے تاریخ لکھتے ہیں۔ تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں برصغیر کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ بہرحال ایسی تاریخیں بہت کم ہیں۔ جو ہندو اور مسلم قومی عصبیت سے بالکل آزاد ہوں۔ خود یورپ میں جو تاریخیں برِصغیر پر اس زمانہ میں شائع ہوئی ہیں۔ کوئی محقق اور انصاف پسند ان پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتا۔ پس جب عصرِ حاضر کا یہ حال ہے، تو قرونِ وسطیٰ کے مورخین کے ہاں مکمل معروضیت کی جستجو بے معنی ہے، علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قرونِ وسطیٰ کے سب مورخ یکساں نہیں تھے، بلکہ ان میں البیرونی، عصامی، ملا عبدالقادر بدایونی، نعمت خاں عالی، اور بہیم تسین جیسے مورخ بھی تھے۔ جو کسی خوف و لالچ سے بلند و بالا ہو کر اپنا قلم آزاد رکھتے تھے۔

چائے نوشی کی مجلس میں پروفیسر جگدیش نرائن سرکار نے جب مجھکو کتاب پیش کی اور میں نے کتاب کا نام پڑھا تو معاً مجھے اندیشہ ہوا کہ انہوں نے قرونِ وسطیٰ کے ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مورخین کے بارے میں اپنے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار کیا ہوگا۔ چنانچہ میں نے ہنس کر کہا کہ ہمارے مورخین میں معروضیت تھی یا نہیں، بہرحال! مجھے تو توقع ہے کہ آپ نے اس کتاب کے لکھنے میں معروضیت ضرور برتی ہوگی، اس فقرہ سے وہ بہت محظوظ ہوئے، وہ میرا مطلب سمجھ گئے تھے۔ بولے، آپ کتاب پڑھ لیجئے۔ اور پھر ازراہِ کرم اپنی رائے سے مطلع کیجئے۔ اب میں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کہتا ہوں کہ اگرچہ اتنی بڑی کتاب کی ہر جزء سے اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ فاضل مصنف نے یہ کتاب بڑی سنجیدگی اور اعتدالِ فکر سے لکھی ہے۔ اور وہ اس پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

۱۳

بیماری اور اس کا روحانی علاج

تالیف:۔ جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب رفیق ندوۃ المصنفین

مصنف نے اس کتاب میں حصولِ صحت اور حصولِ طمانیت و سکینت اور جمعیتِ خاطر کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے۔ "در یاد خدا باش کہ کارے بہ ازیں نیست" کے مصداق قلب کو یادِ خدا سے معمور رکھنے کے طریقے بتائے ہیں، تاکہ قلب پر سکینت کا نزول ہو اور انسان اپنے میں ایسی قوت محسوس کرنے لگے جو صحت جسمانی کیلئے بنیاد کا کام دیتی ہے، اور حوادثِ زمانہ سے پریشان نہ ہوتے ہوئے حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوکر تمام حوادث پر غالب آجاتا ہے،

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے حصہ اول میں شفا بذریعہ فکر اور مراقبہ سے بحث کی گئی ہے، اور حصہ دوم میں شفا بذریعہ دعا اور ذکر سے بحث کی گئی ہے اور آیاتِ قرآنی اور ادعیہ ماثورہ سے حصولِ شفا کا طریقہ بتایا ہے ہر شخص کیلئے مطالعہ کے لائق کتاب متوسط تقطیع ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۲۱۳

قیمت غیر مجلد ۱۰ روپے، مجلد ۱۲ روپے۔

© rasailojaraid.com